دینی جدوجہد میں سیرت سے رہنمائی

سیّد منور حسنؒ

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نبی آخرالزماں ہیں۔ آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں آنا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جہاں قیامت تک قرآنِ پاک کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے، بالکل اسی طریقے سے خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ اور آپؐ کی تعلیمات کو بھی محفوظ رہنا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپؐ کی اُمت، آپؐ کی قائم مقام ہے کہ اس مشن کو لے کر اُٹھے اور اس ہدایت کی علَم بردار بنے۔ آپؐ کی تعلیمات کا خود پیکر بنے، اس کے سانچوں میں ڈھلے، اور دُور تک پھیلی ہوئی دُنیا تک بھی آپؐ کا پیغام پہنچائے۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ اُمت کی حیثیت سے آپؐ کے مشن کے علَم بردار ہیں، انھیں اس بارے میں بھی رہنمائی وہیں سے لینی چاہیے۔

احساسِ ذمہ داری کی شدت

ایک روز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لائے، اپنے منبر پر تشریف فرما ہوئے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ وہاں بیٹھے تھے، ان سے کہا کہ ''عبداللہ! مجھے قرآن سناؤ''۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ قدرے حیران ہوئے، عرض کیا کہ: ''یارسولؐ اللہ! میں قرآن سناؤں؟'' یہ قرآن تو آپؐ پر نازل ہوا ہے، آپؐ ہی سے ہم نے سنا ہے، آپؐ سے ہم تک پہنچا ہے''۔ آپؐ نے فرمایا: ''نہیں، عبداللہ! آج تو جی چاہتا ہے کہ کوئی پڑھے اور مَیں سنوں''۔ حکم تھا، آپؐ اسی طرح منبر پر تشریف فرما رہے اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے نیچے بیٹھے ہوئے سورۃ النساء کی تلاوت شروع۔ جب اس آیت پر پہنچے:

فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا ﴿٤١﴾ (النساء ۴:۴۱) پھر سوچو کہ اُس وقت یہ کیا کریں گے جب ہم ہر اُمت میں سے ایک گواہ

لائیں گے اور ان لوگوں پر تمھیں (یعنی محمدؐ کو) گواہ کی حیثیت سے کھڑا کریں گے۔

اسی دوران حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو اندازہ ہوا کہ جیسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم انھیں ہاتھ کے اشارے سے روک رہے ہیں: حسبك حسبك، عبداللہ ٹھیر جاؤ، عبداللہ ٹھیر جاؤ۔ سر اُٹھا کر دیکھا کہ آں حضوؐر کی آنکھوں سے آنسو رواں ہیں اور ریش مبارک آنسوؤں سے تر ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس گواہی، شہادت اور ذمہ داری کے احساس سے گویا دبے جا رہے ہیں، آنسوؤں کا رواں ہونا پورے جسم و جاں کی کیفیت کی گواہی دے رہا ہے۔

مراد یہ ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس لمحے کے تصور سے پریشان ہیں، جب یہ پوچھا جائے گا: کیا تم نے اس پیغام کو پہنچایا، لوگوں کے دلوں کو گرمایا، ان کے جسم و جان کو ان راہوں پر لگایا، تم نے لوگوں کو منزل کا شعور دیا، تم نے انھیں جدوجہد کا پیکر بنایا، تم نے چار دانگ عالم میں اس نئی کش مکش کی داغ بیل ڈال کر اس کی طرف ان کو بلایا؟ اس احساس کی شدت آپؐ کو رُلا رہی ہے۔

یہ اُمت، آپؐ کی امانت کو آگے پھیلانے اور دوسروں تک پہنچانے کی امین ہے اور آپؐ رہتی دنیا تک اُمت کو اس حوالے سے رہنمائی دے رہے ہیں۔ جو لوگ اس مشن کو لے کر چل رہے ہیں وہ اُن پوری بستیوں، ملکوں اور قوموں کے ذمہ دار ہیں، جہاں وہ اپنے شب و روز بسر کرتے ہیں۔ کبھی اتفاقاً آدمی اپنے آپ سے یہ سوال کرلے کہ: قرآن تو مَیں بھی پڑھتا ہوں اور اگر پوچھ لیا جائے کہ ان بستیوں میں تم نے کیا کام کیا، کتنے دلوں پر دستک دی، کتنے دل کے دریچے کھولنے کا تم ذریعہ اور سبب بنے، اور کتنے دریچہ ہائے دل ایسے تھے جو تکتے رہ گئے کہ کوئی آئے اور بتائے تو سہی کہ اسلام کہتے کس کو ہیں!

ہم نے بارہا وہ واقعہ پڑھا، یا سنا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حالتِ قیام میں سورۂ ابراہیم کی تلاوت فرماتے ہوئے جب اس آیت پر پہنچے:

رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (ابراہیم ۱۴:۳۶) پروردگار، ان بتوں نے بہتوں کو گمراہی میں ڈالا ہے (ممکن ہے کہ میری اولاد کو بھی یہ گمراہ کردیں، لہٰذا ان میں سے) جو میرے طریقے پر چلے وہ میرا ہے اور جو میرے خلاف طریقہ اختیار کرے تو یقیناً تُو

درگزر کرنے والا مہربان ہے۔

تو اس آیت کو پڑھتے تھے اور روتے تھے اور بار بار آیت کے اس حصّے کو دہراتے تھے: فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ ۚ وَمَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۳۶﴾ تا آنکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جبریل امینؑ کو بھیجا۔ جبریل امینؑ تشریف لاتے ہیں اور ماجرا پوچھتے ہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کی اس دُعا کو پڑھتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ انھوں نے تو اپنی اُمت کے لیے سبھی کچھ مانگ لیا کہ جو لوگ میرا اتباع کرنے والے ہیں وہ تو میرے ہیں، لیکن جو لوگ گناہ اور غفلت کے راستے پر جانے والے، گمراہ ہوجانے والے ہیں، تو تُو خود ہی بڑا معاف کرنے والا ہے۔ گویا حضرت ابراہیمؑ نے اپنی اُمت کے لیے سبھی کچھ مانگ لیا، لیکن جب میں اس دُعا کو پڑھتا ہوں تو اپنی اُمت کا خیال ستاتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے رواں آنسو اپنی اُمت کے بارے میں فکرمندی کو اس کا سبب بتا رہے ہیں۔ واقعات کے مطابق حضرت جبریل امینؑ واپس جاتے ہیں اور آکر یہ خوش خبری سناتے ہیں کہ آپؐ کی اُمت کے بارے میں اللہ تعالیٰ آپ کو خوش کردے گا۔

اللہ سے تعلق

اگر ہم نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امانت کی پاس داری کرنی ہے، اور ان کے مشن کو لے کر آگے بڑھنا ہے تو یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک اسوۂ حسنہ کی مکمل طور پر تابع داری اور اطاعت نہ کی جائے۔ جب تک حالتِ قیام سے، قرآنِ پاک کے ساتھ شغف سے، فی الواقع ایک مستحضر علم، اور وسعتِ علم کے نتیجے میں اپنے آپ کو بنایا نہ جائے، کوئی بڑا کام تو دُور کی بات ہے، اس ذمہ داری کا ہلکا سا بوجھ بھی نہیں اُٹھایا جاسکتا۔ ہم میں سے ہر ایک کو اپنے طور طریقوں اور رویوں میں، اپنے شب و روز کے معمولات اور اپنے مشاغل و مصروفیات میں تبدیلی لانی چاہیے۔ اس بات کو دیکھنا چاہیے کہ جو ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے، اس کے بوجھ کو ہلکا کرنے اور فی الحقیقت اس کو نبھانے کے لیے کیا کچھ کیا جاسکتا ہے؟ فرداً فرداً تو کوئی کسی کو نہیں بتا سکتا، لیکن ہر شخص اپنے بارے میں خوب جانتا ہے، اسی کے مطابق اس کو اپنے لیے لائحہ عمل مرتب کرنا چاہیے۔ اسی چیز کا نام تعلق باللہ ہے، یعنی ہر بندے کا اپنے ربّ کے ساتھ جو تعلق اور استواری ہے، مسلسل

اس میں منہمک رہنا ضروری ہے۔

گویا جو لوگ ان راہوں پر چلے ہیں ان کا فرض ہے کہ ربّ کے ساتھ اپنے تعلق کو مستحکم اور مضبوط کریں۔ جس کا کام کر رہے ہیں اسی کے ساتھ اگر رابطہ ٹوٹا رہے گا، جس کی دعوت لے کر اُٹھے ہیں اسی کے ساتھ تعلق اگر ضعف اور کمزوری کا شکار ہوگا، تو ذرا سوچیے کہ کہاں سے طاقت ملے گی اور کہاں سے نصرت و تائید آئے گی؟ نصرت و تائید کی بات بعض اوقات لفظوں میں سمجھ نہیں آتی۔ یہ جو انسان کی طبیعت میں انشراحِ صدر پیدا ہوتا ہے، قدموں کے اندر جماؤ اور حوصلہ پیدا ہوتا ہے، انسان نامساعد حالات میں صبر کی چٹان نظر آتا ہے اور حالات کی خرابی کے باوجود تحمل کا کوہِ گراں دکھائی دیتا ہے، اسی کو نصرت اور تائید کہتے ہیں۔ اسی کے نتیجے میں یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کمزور بندوں اور اپنے راستے پر چلنے والوں کی کس کس طریقے سے مدد کرتا ہے۔ کیسے وہ ان کی آنکھیں بن جاتا ہے جن سے وہ دیکھتے ہیں، کیسے وہ ان کے پیر بن جاتا ہے جن سے وہ چلتے ہیں، اور کیسے وہ ان کے ہاتھ بن جاتا ہے جن سے وہ پکڑتے اور بُرائی سے مقابلہ کرتے ہیں۔

سیرت کے ہر واقعے کے اندر رہنمائی موجود ہے۔ کچھ نہیں تو آنکھوں کے لیے نمی، دلوں کے لیے گداز اور قلوب کے لیے خوف و خشیت کی کیفیت موجود ہے۔ اگر ان تمام واقعات کو زمانی ترتیب کے ساتھ جوڑ لیں کہ ایک واقعہ پیش آیا، پھر دوسرا پیش آیا، صبح کو یہ ہوا، پھر دوپہر کو اور شام کو یہ ہوا۔ پھر لوگوں نے راستے میں کانٹے بچھا دیے، پتھر برسانے اور گالیاں بکنے لگے۔ پھر لوگوں نے حالتِ نماز میں اوجھ رکھ دی۔ اور آخرکار ہجرت پر مجبور کر دیا۔ یہ تمام واقعات ترتیب کے ساتھ جمع کر کے پڑھیں تو لگے گا کہ واقعی یہ تو پہلے دن سے کسی منزل کا تعین کر کے ایک انقلاب کی طرف رہنمائی ہو رہی ہے، اور لوگوں کو ایک بڑے مقصد کی طرف بلایا جا رہا ہے۔ یہ اتفاقی اور حادثاتی طور پر رُونما ہونے والے واقعات نہیں ہیں۔ سیرت کے تمام واقعات ایک مقصد کی طرف لے جاتے ہیں، ایک واضح منزل کا شعور دیتے ہیں۔

راہِ دعوت کی مشکلات

واقعۂ طائف پر نظر ڈالیے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مصائب و شدائد کا دور مکہ میں گزارا ہے۔ مکہ میں جب دعوت و تبلیغ کا فریضہ ادا کرتے اور اللہ کی طرف بلاتے ہوئے آپؐ کو

ایک مدت گزر گئی، تو یہ احساس ہوا کہ بہت تھوڑے لوگ اس دعوت کو قبول کر رہے ہیں اور بہت کم پذیرائی حاصل ہورہی ہے۔ گویا ایک جائزہ لیا۔ پھر آپؐ نے طے کیا کہ مکہ کے لوگ تو بات قبول ہی نہیں کر رہے ہیں، چلو طائف کا رُخ کرتے ہیں۔ کیا عجب کہ طائف کے لوگ اس دعوت کو قبول کرلیں۔ کیا عجب کہ یہ دعوت ریاست قرار پائے، یہ دعوت مقتدر ہوجائے اور اسی دعوت کا سکّہ رواں ہوجائے۔ یہ دعوت قیل و قال کے حوالوں سے بھی جانی جائے اور احکامات و ہدایات کے نازل ہونے اور ان پر عمل درآمد کے حوالے سے بھی پہچانی جائے۔ اس تجزیے، ان اُمیدوں اور اس فکر کے ساتھ آپؐ نے طائف کا سفر کیا۔

لیکن اللہ تبارک و تعالیٰ کی مشیت اپنی ہے، اللہ تبارک و تعالیٰ جو پوری کائنات کا فرماں رواں ہے، وہ اپنے محبوب ترین بندے کو دیکھتا ہے کہ ستایا جارہا ہے، اُلٹے پیروں لوٹایا جارہا ہے، جابجا پتھروں کی بارش اور گالیوں کی یورش میں ایک مضبوط انسان کی حیثیت سے کھڑا ہے۔ اس کیفیت کو بیان کرنے کے لیے الفاظ تلاش کرنا مشکل ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب ۳۳:۲۱) درحقیقت تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسولؐ میں ایک بہترین نمونہ ہے۔

اللہ تعالیٰ چاہتا تو ایک لمحے کے اندر کن اور فیکون کے مصداق اسلامی نظام قائم ہوجاتا، توحید کی امارت قائم ہوجاتی، دین غالب ہوجاتا۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا اور خود آپؐ کو ۲۳ سال لگے ہیں اور ساری مشکلات اور صعوبتوں کو انگیز کیا ہے۔ گویا اس سنت اور اسوہ کو قائم کرنا مطلوب تھا کہ رہتی دنیا تک جو لوگ اس دعوت کے غلبے کے لیے اُٹھیں گے، ان کے سامنے یہ اسوہ ہوگا کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب ترین بندے کو ان راہوں سے گزارا ہے، تو ہمیں ہتھیلی پر سرسوں جمانے کو نہیں ملے گی۔

اُمید کا دامن

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف کا سفر دعوت کے غلبے کی تمنا اور آرزو کے ساتھ کیا ہے۔ لیکن یہ بات کسی سے مخفی نہیں ہے کہ اہلِ طائف نے آپؐ کے ساتھ جو سلوک کیا، اس کے سامنے لغت بے چاری ہاتھ جوڑ کے کھڑی ہوجاتی ہے کہ مجھ سے نہیں بیان کیا جاتا، کہ کیا سلوک

آپؐ کے ساتھ روا رکھا گیا۔ کسی نے کہا کہ اچھا تو اللہ تعالیٰ کو کوئی اور نہیں ملا تھا؟ ایسے آدمی کو تو مَیں نبی نہیں مان سکتا، یعنی طنز اور تمسخر کے جو تیر اور نشانے ہو سکتے تھے، وہ سب آزمائے گئے۔ اہلِ طائف نے دل و دماغ کی دنیا کو ویران کرنے کے لیے وہ سب کچھ کیا، جو انسانی سطح پر کیا جاسکتا ہے۔ ٹولیوں میں لوگ آتے، دھکا دے کر گرانے کی کوشش کرتے، اور کہتے نبی ہو، گرتے کیوں ہو؟ سیدھے کھڑے رہو نا!___ اب ذرا تصور کیجیے کہ کن اُمیدوں کے ساتھ آپؐ گئے ہیں، کیا توقعات لے کر آپؐ نے یہ سفر کیا ہے اور کیا کچھ پیش آرہا ہے۔

گویا دعوت کے راستے میں آپ بہت کام کریں گے لیکن نتیجہ بالکل مختلف نکلے گا۔ آپ منزل کی طرف چلنے کی شعوری کوششیں کریں گے جن کا نتیجہ دو جمع دو چار کی صورت میں نکلنا چاہیے لیکن وہ صفر نکلتا ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے بتا دیا ہے کہ اس راستے میں ان مشکلات کو انگیز کیے، صعوبتوں کو اُٹھائے اور ان آزمایشوں کو جھیلے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتے۔

صبح سے لے کر شام ہوگئی ہے، ہر دَر پہ آپ دستک دیتے ہیں، ہر دل کی دنیا کو بسانے اور ویرانوں کو ہٹانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن کوئی ایک فرد نہیں ملتا جو بات سننے والا ہو، جو آپؐ کی دعوت پر توجہ دینے والا ہو۔ کس قدر مایوسی ہونی چاہیے اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر آیندہ کے لیے آدمی کو کچھ نہ کرنے کا طے کر لینا چاہیے کہ یہ انسان تو عجیب و غریب ہیں، یہ تو خونخوار بھیڑیے ہیں، ان سے کیا بات کرنی، یہ تو سب جہنّمی ہیں۔ لیکن محسن عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ بتاتا ہے کہ داعی کبھی اپنے مخاطبین کے بارے میں فتوے نہیں دیتا، لوگوں سے مایوس نہیں ہوتا، اپنے حصّے کا کام کرنا اور لوگوں سے اچھی اُمیدیں اور توقعات باندھنا ہی اس کے ذمے ہے۔

واقعات کے مطابق جب آپؐ بالآخر طائف سے واپس لوٹنے لگے تو اہلِ طائف جو کچھ کر چکے تھے، اسی پر بس نہ کیا بلکہ گلی کے بچوں اور لچے لفنگوں کو آپؐ کے پیچھے لگا دیا۔ آپؐ چلتے جاتے تھے اور بچے آپؐ پر پتھراؤ کر رہے تھے۔ حضرت زید بن حارثہؓ جو آپؐ کے ہمراہ تھے، ان کے بارے میں روایات ہیں کہ جب آپؐ پر سامنے سے پتھراؤ ہوتا تھا تو وہ سامنے ڈھال بن کر کھڑے ہوجاتے تھے مگر پتھراؤ پیچھے سے شروع ہوجاتا تھا۔ جب پتھراؤ پیچھے سے شروع ہوجاتا تو آپؐ ڈھال بننے کے لیے پیچھے کھڑے ہوجاتے تھے۔ ذرا سوچیے، ایک فرد ہے اور چاروں

طرف سے پتھروں کی بارش ہے۔ کیسے تحفظ دے، کیسے ڈھال بنے؟ وہ اپنا کام کر رہے تھے، اپنے درجات بلند کر رہے تھے، اپنے آپ کو رضاے الٰہی کا مستحق بنا رہے تھے۔ آپؐ کے جسمِ اطہر سے اس قدر خون رسا کہ آپؐ کے جوتوں میں آپؐ کے پاؤں جم گئے۔ کتنی آسانی سے مَیں نے بیان کر دیا ہے اور آپ نے پڑھ بھی لیا ہے۔ ذرا اس کا تصور تو کیجیے کہ کیا ہوا ہوگا اور کیا بیتی ہوگی، کتنا وقت لگا ہوگا کہ خون رستے رستے پیروں کو جوتوں کے اندر جما دے!

تا آنکہ آپ بستی سے نکل کر ایک درخت کے نیچے ستانے کو بیٹھتے ہیں۔ اس وقت حضرت جبریل امینؑ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ پیغام لے کر آتے ہیں کہ یہ فرشتہ ساتھ لایا ہوں، آپؐ اشارہ کیجیے کہ اللہ کے حکم سے یہ فرشتہ طائف کی اس بستی کو جو دو پہاڑوں کے درمیان آباد ہے، ان دونوں پہاڑوں کو ملا دے، بستی ریزہ ریزہ ہوجائے، خاک وخون اور پوری تاریخ کے اندر عبرت کا نشان بن جائے۔

انسانی سطح پر ذرا تصور کیجیے کہ کس قدر سنہری پیش کش ہے کہ جن لوگوں نے ستایا، ان سے انتقام لینے کا نادر ترین موقع ہاتھ آ گیا کہ ان کو تہس نہس کر دیا جائے، اور ان کا کوئی نام لیوا باقی نہ چھوڑا جائے۔

ذرا سارے منظر نامے پر غور کیجیے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہے اور آپؐ کے اسوۂ حسنہ پر قربان جایئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ ''نہیں، یہ نہیں تو ان کے بعد والے ایمان لے آئیں گے''۔ کیسی توقعات ہیں۔ جو توقعات ان سے باندھی تھیں وہ تو پوری نہیں ہوئیں، لیکن فرمایا کہ یہ نہیں تو بعد والے اور آیندہ نسلیں ایمان لے آئیں گی۔ یہ زندہ رہیں گے تو آیندہ نسلیں مسلمان ہوں گی۔ وژن دیکھیے، بصیرت دیکھیے، توقعات اور اُمیدوں کا محل دیکھیے، صبر وتحمل کا کوہِ گراں دیکھیے، اور انسانوں کے ساتھ خیرخواہی دیکھیے!

یہ الفاظ آپؐ کی زبانِ مبارک سے نکلتے ہیں اور پھر آپؐ سجدے میں سر رکھ دیتے ہیں، اپنے ربّ سے مناجات کرتے ہیں، ہم کلامی کا شرف حاصل کرتے ہیں، اور اپنی پوری کارکردگی کی رپورٹ پیش کرتے ہیں، اور الفاظ سے لگتا ہے کہ اپنائیت کے الفاظ و انداز میں جو شکوہ ہوسکتا ہے وہ کر رہے ہیں کہ مولا! تو نے مجھے کن کے حوالے کر دیا ہے، جو میری بات کو سمجھتے نہیں ہیں، میرے پیغام کو جانتے نہیں ہیں، اس لیے مخالفت کر رہے ہیں۔ ان جملوں کے اندر ان کی خیرخواہی مطلوب ہے، اور اتباع و پیروی اور دعوت و انقلاب کے راستے پر چلنے والوں کے لیے رہنمائی ہے۔ پھر

فرماتے ہیں کہ مولا! جو کچھ ہوگیا ہے اگر تو اسی پر راضی ہے تو میں بھی اس پر راضی ہوں۔ گویا ربّ کی رضا ہی اصل چیز ہے۔

تعلق باللہ کی یہ کیفیت ایک داعی دوسروں میں اسی وقت پیدا کرسکتا ہے، جب خود اس کے اندر اس تعلق کی آبیاری کا جذبہ موجود ہو۔ اللہ کے ساتھ تعلق کی آبیاری ہر روز اور ہر صبح وشام کا کام ہے، اتفاقی یا حادثاتی طور پر کبھی کبھار کرنے کا کام نہیں۔ قرآن وسنت اور سیرت و حدیث کے حوالے سے مسلسل اپنی طبیعتوں کو نکھارنے کا اہتمام کرنا تحریکِ اسلامی کے ہر کارکن اور ذمہ دار کا فرض بنتا ہے۔ روزانہ کچھ وقت مقرر کریں کہ ان اوقات میں انفرادی دائرے میں اور چل پھر کر اجتماعی دائرے میں اپنے ربّ کے ساتھ قربت کی منازل کو طے کریں۔

بُرائی کے خلاف اُٹھنا

حضرت عائشہ صدیقہؓ بیان کرتی ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لائے اور مَیں نے آپؐ کے چہرۂ انور کو دیکھ کر پہچان لیا کہ آپؐ کچھ فرمانے والے ہیں۔ مَیں متوجہ ہوگئی کہ آپؐ گھر کے اندر داخل ہوئے، وضو فرمایا اور خاموشی سے مسجد کی طرف چلے گئے۔ میں مسجد کی دیوار سے کان لگا کر کھڑی ہوگئی کہ سنوں آپؐ کیا ارشاد فرماتے ہیں۔ آپؐ منبر پر تشریف فرما ہوئے اور فرمایا کہ لوگو! اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے: اگر تم منکر کے خلاف نہیں اُٹھو گے، بُرائی کو نہیں روکو گے، اس کی طرف لوگوں کو متوجہ اور تنبیہہ نہیں کرو گے تو تم مجھ سے لمبی لمبی دُعائیں مانگو گے، میں ان کو تمھارے منہ پر دے ماروں گا۔ تم مجھ سے التجائیں کرو گے میں ان کو نامنظور کردوں گا اور تمھاری طرف پلٹ کر بھی نہیں دیکھوں گا۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کہتی ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بس اتنا ہی ارشاد فرمایا اور منبر سے نیچے اُتر آئے۔

گویا بُرائی کو دیکھنا اور برداشت کر لینا گوارا نہیں ہوسکتا۔ چاروں طرف معاشرے میں منکرات کے کانٹے بچھے ہوئے ہیں۔ چاروں طرف دیوہیکل بُرائیاں دندناتی پھرتی ہیں۔ انھی کی پالیسیاں ہیں، انھی کا راج ہے اور حرام کاری کے کاروبار جاری و ساری ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ ہماری طبیعت پر کتنے گراں گزرتے ہیں؟ کچھ کرنے اور کر گزرنے کے لیے کتنی آمادگی پیدا ہوتی ہے؟ کتنے اقدامات اور تدبیریں ہیں، جو ہم انفرادی اور اجتماعی دائروں میں اختیار کرتے ہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ یہ بات بدرجۂ اولیٰ ہم سے پوچھی جانی ہے۔ ہم جو دین کے دعوے دار بن کر اُٹھے ہیں، حضرت عائشہ صدیقہؓ اسی طرف رہنمائی فرما رہی ہیں۔

تزکیہ اور تربیت کا مقصد

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''اللہ نے تم کو ایمان کی محبت دی اور اس کو تمھارے لیے دل پسند بنادیا اور کفر و فسق اور نافرمانی سے تم کو متنفر کر دیا۔ ایسے ہی لوگ اللہ کے فضل و احسان سے راست رو ہیں اور اللہ علیم و حکیم ہے'' (الحجرات ۴۹:۷-۸)۔

یعنی اس تمام تربیت اور تزکیے سے ایک ایسا انسان مطلوب ہے جس کے دل و دماغ میں ایمان کی محبت پیوست ہوجائے اور ایمان سے ہٹنے اور اس سے دُور جانے کا تصور بھی ذہن اور عمل کے اندر محال ہوجائے۔ قلوب کے اندر یہ محبت اس طرح رچ بس جائے کہ اس کے نتیجے میں ہر معصیت، ہر گناہ اور ہر نافرمانی انسان کو جیتے جی ایک عذاب سے دوچار کردے۔ یہ جو چاروں طرف گناہوں کا کاروبار نظر آتا ہے اور انسان کو اپنی طرف بلاتا اور بہلاتا پھسلاتا ہے، معصیت اور نافرمانی کے اَن گنت عنوانات دنیا کو بنانے، زندگی کو کل سے بہتر آج، اور آج سے بہتر کل کی شکل دینے کے لیے موجود ہیں، اور پھر انسان کے جسم و جان کو راحت پہنچانے کے وہ تمام مراحل جو نافرمانی کے ذیل میں آتے ہیں، ان کے قریب جانے یا ان کا خیال آنے سے بھی رونگٹے کھڑے ہوجائیں۔ یہ منزلِ مقصود ہے کہ انسان کے اپنے اندر ایک مربی و مزکی اور ایک محتسب موجود ہو، کوئی روکنے ٹوکنے اور اندر سے خبردار کرنے والا ہو، جو ہاتھ پکڑ لے اور کہے کہ بھلے آدمی یہ تمھیں کیا ہوگیا ہے، یہ تم کیا کر رہے ہو؟

ہر شخص خود ہی اپنا جائزہ لے کر اپنے بارے میں حتمی رائے دے سکتا اور فتویٰ صادر کرسکتا ہے کہ اس آیت کے اندر جو کیفیت بتائی گئی ہے۔ اگر یہ کیفیت ہے اور اس کے اندر بڑھوتری ہے تو یہ مطلوب ہے، اور یہ عمل زندگی کے آخری سانس تک جاری رہنا چاہیے۔ دعوت و تربیت کے مختلف مراحل فی نفسہٖ ہمیں پوری زندگی کے لیے رہنمائی فراہم کرتے اور اس کے لیے تیار کرتے ہیں کہ ہم خود اپنے نگران اور مربی، اور ایک مدرس و مقرر کی حیثیت سے مسلسل اپنے اُوپر نگاہ رکھ سکیں، اور اس آیت کا مصداق بننے اور اس کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے کے لیے کوشاں ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جس مقصد کے لیے مبعوث کیا گیا تھا، آپؐ نے اپنی زندگی اسی جدوجہد میں لگا کر اس کا حق ادا کر دیا۔ غلبۂ دین کی جدوجہد میں حصّہ لینا، اقامتِ دین کا فریضہ انجام دینا، بڑے پیمانے پر انسانوں کو ظلم کی طویل رات سے نجات دلانا، جھوٹے خداؤں اور طاغوت کی فرماں روائی سے بچانا اور انھیں اپنے ربّ کی طرف بلانا—— یہ کام ثبات و استقامت اور اُولوالعزمی، اور ہر طرح کی آزمایش کو خندہ پیشانی سے جھیلنے کا مطالبہ کرتا ہے۔

رزم خیر و شر سے آگہی

غلبۂ دین کی جدوجہد کے حوالے سے یہ بات بھی ہمارے پیش نظر رہنی چاہیے کہ نیکی کو اپنانے اور خیر کی طرف بڑھنے، بھلائی کا شعور پیدا کرنے، حسنات کے حرص و لالچ کو اپنی طبیعت کے اندر پانے کا رجحان تو موجود ہوتا ہے، لیکن خیر کا کوئی علم نتیجہ خیز نہیں ہوسکتا، جب تک کہ شر کا علم بھی موجود نہ ہو۔ شر کے جو سرچشمے ہیں، بُرائی کی جو جڑیں ہیں، اس کا جو پورا نظام ہے، فتنے اور اس کے جو اسباب ہیں، فی زمانہ شر کی جو حکمت عملی اور اس کی یلغار کی جو صورتیں ہیں، ان کے بارے میں علم حاصل کرنا اُسی طرح ضروری ہے جس طرح کہ خیر کے بارے میں جاننا لازم ہے۔

حضرت حذیفہ بن یمانؓ فرماتے ہیں کہ دیگر صحابہ کرامؓ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوتے تھے تو خیر، بھلائی اور نیکی اور جنّت کے بارے میں سوال کرتے تھے، لیکن میں جب بھی حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوتا تو مَیں آپؐ سے شر اور فتنوں کے بارے میں پوچھتا تھا، اور ان کے سدباب اور مقابلے کے حوالے سے سوال کرتا تھا۔ صحابہ کرامؓ کے درمیان جو مختلف خصوصیات پائی جاتی ہیں اور بعد میں اُمت نے مختلف حوالوں سے ان سے استفادہ کیا ہے، حضرت حذیفہؓ اس لحاظ سے منفرد اعزاز رکھتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے انھوں نے فتنوں اور مسلمانوں کی ناکامیوں اور ہزیمتوں کے حوالے سے بھی تمام پیش گوئیوں کو حاصل کیا ہے۔ صحابہ کرامؓ کو اس حوالے سے جب دِقّت پیش آتی تھی اور معاملہ فہمی کا مسئلہ درپیش ہوتا تھا تو وہ حضرت حذیفہؓ سے رجوع کرتے تھے۔

سیرتِ پاکؐ کے یہ واقعات تعلیم و تربیت اور ایمان و عزیمت کا چلتا پھرتا، جھنجھوڑتا اور ثابت قدمی کا نصاب ہیں۔